© rasailojaraid.com

دِہ غلامان! ایک تاریخی جائزہ

جمیل یوسفزئی*

جارشہ دھوا او حرص خیال ترقناعتہ!
چرتہ شار د مصر چرتہ دِہ غلامان
(رحمان بابا)

ترجمہ: ہوا و حرص کو قناعت پر قربان کیا جا سکتا ہے۔
کیونکہ مصر کا شہر، دِہ غلامان، سے افضل نہیں ہے۔

دِہ غلامان کی پانچ تاریخی منزلیں

پہلی منزل

پشتونوں کی تاریخ میں دورِ اکبری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اِس دورِ زرّیں سے پشتونوں کی بہت تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ ازاں جملہ تحریکِ روشنائیہ یا روشانیہ بھی ہے۔ کہنے کو یہ تحریک نیم سیاسی مذہبی یا نیم مذہبی سیاسی تحریک تھی۔ لیکن اس تحریک کے نہایت دور رس اثرات پشتون تاریخ پر مرتب ہوئے، پشتو لکھت پڑھت اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ فی الاصل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ دورِ اکبری سے پہلے پشتو زبان کی رسم الخط موجود تھی۔ کسی حد تک تصنیف و تالیف کا کام بھی ہوا تھا مگر اس تحریک کا لازمی نتیجہ قوم پرستی اور مذہبی مناقشات کی شکل میں برآمد ہوا۔ جس سے قومی وحدت تو پارہ پارہ ہوگئی البتہ شعر و ادب کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ تصوّف نے پشتو شعر میں بار پایا اور پشتو کا حماسی، (عسکری) ادب وجود پذیر ہوا۔ سیاسی اُفق پر قوم پرستی کا سورج طلوع ہوا، مُغل دشمنی قوم پرستوں کا شعار بن گئی۔ زبان و ادب میں ''مذہب اور مغل'' کے تعلق سے کئی محاورے اور حوالے داخل

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، شیوا، صوابی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گئے۔ جو ابتک جزوِ زبان ہیں۔ اب بھی شعراء کی اکثریت ان محاورات اور حوالہ جات کا استعمال کرتی نظر آتی ہے۔

پس منظر

اپنی منزل کی طرف بڑھنے سے پہلے میں قارئینِ کرام کو ان مناقشات و مشاجرات کے کرداروں سے متعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان تحاریک میں دو فریق تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں غیر پشتون تھے اور پشتون ان کے پیروکار بن گئے۔

فریقِ اول

فریقِ اول سید علی ترمذی تھے، جن کے والد کا نام قنبر علی تھا۔ زوجۂ قنبر علی[۱] بادشاہ ہمایوں کی عزیزہ اور قریبی رشتہ دار تھی۔ چونکہ قنبر علی درباداری اور سپہ گری سے تعلق رکھتے تھے اسی وجہ سے سید علی کی پرورش ان کے دادا سید احمد نے کی۔ بعد ازاں حصول علم کی خاطر انہوں نے افغانستان اورہندوستان کا سفر کیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جس وقت بادشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں در بدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اسی عالم سراسیمگی میں قنبر علی بھی حقِ نمک ادا کر رہا تھا۔ اثنائے سفر باپ بیٹے کے درمیان ملاقات بھی ہوئی۔ قنبر علی نے بیٹے کو ایک بدرہ اشرفیوں کا دیا۔ جسے افغان سپاہ چھین کر لے گئے۔[۲]

ہندوستان کے سفر کے بعد، سید علی ترمذی نے کوہستان روہ کا رخ کیا دریائے سندھ پار کر کے موضع رستم میں سکونت اختیار کی۔ یہاں پر ان کے زہد و تقشّف کے چرچے ہوئے۔ شادی بھی یہیں کی۔[۳] پھر نا موافق حالات کی بناء پر سید علی ترمذی نے بونیر کو مسکن بنا لیا۔ ان کی شہرت دور و نزدیک ہونے لگی۔ تصوّف سے شغف کے باعث پیر بابا کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آج بھی ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ ان کی وفات ۱۵۵۶ء میں ۷۱ سال کی عمر میں ہوئی۔ حضرت پیر بابا نسباً حسینی سادات کے چشم و چراغ تھے۔ لساناً وہ ترک تھے۔ طویل مسافرت اور قیامِ کوہستان کی وجہ سے وہ مقامی زبانوں سے بھی آشنا تھے۔

اخون درویزہ

فریق اول کے دوسرے کماندار اخون درویزہ تھے۔ درویزہ ان کا نام تھا۔ نسلاً تاجک تھے۔ حدودِ افغانستان میں ان کی پیدائش ہوئی۔ مُلا زنگی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ادھیڑ عمر میں سید علی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترمذی المعروف پیر بابا سے ملاقات ہوئی۔ علاقہ رستم اور بعد ازاں بونیر میں اپنے مرشد کے ساتھ رہے۔ بونیر ہی میں تحریک روشانیہ کے خلاف کتابیں لکھیں۔ اور بقول ان کے بایزید روشن کے ساتھ ان کے کئی مناظرے ہوئے۔ بایزید روشن کی مشہور کتاب خیر البیان کے جواب میں اخون درویزہ نے تذکرۃ الابرار و الاشرار لکھی۔ جس میں اس وقت کی پشتون سوسائٹی کی تصویر دھندلائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اخون درویزہ نے ایک اور کتاب مخزن بزبان پشتو لکھی جس کے طرزِ کلام پر خوشحال خان خٹک نے نکتہ چینی کی ہے۔[۴]

فریق ثانی

تذکرۂ افاغنہ بایزید روشن کے ذکر کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ بایزید کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ موصوف جنوبی وزیرستان کے گاؤں کانی گرام کے رہنے والے تھے۔ بایزید روشن ان کی دوسری بیوی آمنہ کا بیٹا تھا۔ عبداللہ کے سُسر بسلسلۂ تجارت جالندھر میں مقیم تھے۔[۵] بایزید کی پیدائش یہیں پر ہوئی۔ بچپن پنجاب کی ننھالوں میں گزارا۔ پنجابی زبان پر دسترس کا فائدہ انہیں خیر البیان کے لکھنے میں ہوا۔ کیونکہ کتاب مذکور چار زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ پنجابی زبان کی تاریخ میں بایزید انصاری کی بڑی اہمیت ہے۔ بایزید روشن جنہیں اخون درویزہ بایزید تاریک یا پیر تاریک کے نام سے یاد کرتا ہے بنیادی طور پر تصوّف سے منسلک تھے۔ چونکہ وہ وزیرستان سے وادئ پشاور آ گئے تھے۔ جو کہ میدانی علاقہ ہے۔ نزاعی مسائل پر ان کا مقامی علماء سے اختلاف ہو گیا۔ بات حکام تک پہنچ گئی۔ حکام نے روشانیوں کی مقبولیت کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ للہذا تحریک روشانیہ کو دبانے کے لیے حکومت وقت کی سپہ حرکت میں آ گئی۔ دوسری طرف علمی محاذ پر حضرت پیر بابا اوراخون درویزہ کے ساتھ مناظرات کی لڑائی ہونے لگی۔ جو مناقشاتِ افاغنہ کا ایک روشن باب ہے۔

بایزید روشن کے بیٹوں میں قابل ذکر جلال الدین المعروف بہ جلالہ ہے۔ جو ہماری پہلی منزل کا ہیرو ہے۔ دوسرا قابل ذکر سپہ سالار ملا میرو یوسفزئی ہے۔ اِسی مُلا میرو کا ایک رشتہ دار مصری خان شہید ہماری دوسری منزل کا سُورما ہے۔

کشمکش

حضرت پیر بابا اور بایزیدروشن کے درمیان بعض علمی مسائل پر نزاع ہوا۔ یہ نزاع آہستہ آہستہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقاعدہ جنگ کی طرف بڑھتا گیا۔ اِسی نزاع میں حسب دستور عوام نے بھی حصہ لیا۔ بایزید کی وفات کے بعد مذکورہ نزاع سے عوام میں اشتعال بھڑکایا گیا۔ پھر اشتعال نے لشکر کشی کی صورت اختیار کی۔ روشانیوں پر ہر طرف سے یلغار ہوئی۔ موضع سرخابی میں زبردست جنگ ہوئی۔ روشانیوں نے درہ امبیلہ کا رخ کیا (یہ ٹھیک وہی مقام ہے جہاں انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان ۱۸۶۳ء میں معرکہ کارزار گرم ہوا تھا) اِسی درہ کے پانی ڈھال (slope) پر مردان، صوابی اور بونیر کی سرحدیں ملتی ہیں۔ پانی ڈھال (slope) کے سرے پر روشانی لشکر نے ضلع صوابی میں قدم رکھا۔ پہاڑ سے اُتر کر، براستہ بہو، امان کوٹ اور نوگرام یہ لشکر موضع مینی پہنچ گیا۔ موضع بہو کے چشمہ پر اس لشکر نے رات گزاری تھی۔[6] اگرچہ یہ تفصیلات *حالنامہ* کے مصنف کی ہیں تاہم یہ اتنی صاف ہیں کہ آج بھی اس رستے کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ بہو ایک گاؤں کا نام ہے۔ جہاں پانی کا چشمہ آج بھی موجود ہے۔

جنگ مینی

جنگ سرخابی کے بعد موضع مینی کے قریب زبردست رن پڑا۔ یہ مقام صاحبزادہ خورشید میموریل کالج کے پاس ہے۔ یہ جنگ خاصی لمبی تھی۔ کیونکہ کوتل کے اطراف میں بڑے بڑے قبرستان موجود ہیں۔ کالج مذکور کے سامنے جو قبرستان ہے وہ قبرستانِ مُلا میرو کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ لشکر روشانیہ کی کمان سردار مُلا میرو کے ہاتھ میں تھی اور وہ یہیں واصل بحق ہوئے تھے اسلئے یہ قبرستان اس کے نام سے مشہور ہوا۔ قبرستان مذکور کی قبریں نئی اور تازی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض قبروں کے گرد احاطہ بھی ہے۔ ایک دو قبریں نمایاں اور بڑی ہیں شاید ان میں ایک مُلا میرو کی بھی ہو۔ دوسری طرف کی قبریں مخدوش ہیں۔ دونوں قبرستانوں میں کسی قسم کا کوئی کتبہ موجود نہیں ہے۔ واضح رہے کہ یہ قبرستان ۹۸۹ھ کے ہیں۔

جنگ باڑہ

جنگ مینی کے بعد روشانیوں کا بچا کھچا لشکر دریائے سندھ کی طرف بڑھ گیا۔ در اصل سردار روشانیہ کا ارادہ حدودِ روہستان سے نکلنے کا تھا۔ انہوں دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے باسیوں سے خط و کتابت کی اور ان سے پناہ کی درخواست کی جو علاقہ چھچھ کے عوام نے منظور کی۔ اگرچہ بعد میں وہ اپنے اِس وعدے سے منحرف ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں لشکرِ روشانیہ کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگ باڑہ عین اس جگہ لڑی گئی تھی جس جگہ تربیلا ڈیم بنا ہوا ہے۔ جنگ میں طرفین نے خوب دادِ شجاعت دی۔ روشانیہ افواج کا کماندارِ اعلیٰ بایزید کا بڑا بیٹا شیخ عمر تھا۔ جبکہ عساکرِ سوات و بونیر کا سردارِ لشکر حمزہ خان تھا۔ حمزہ خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خوانین سوات (تھانہ) کا نمائندہ اور جدامجد تھا۔ روشانی تحریک کا زوال در اصل حمزہ خان سے چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ تھا۔ خوانین افاغنہ کا اپنا ایک مزاج ہے۔ جسے وہ سب سے الگ اور سب سے فائق سمجھتے ہیں۔ جہاں کہیں مذاہب اور پشتون روایات کا موازنہ آتا ہے پشتونوں نے ہمیشہ پشتون ولی (پشتون روایات) کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ [7]

فرقہ روشانیہ کے استیصال میں مخالفین نے دو امور کا سہارا لیا تھا۔اول فرقہ روشانیہ کے علمبردار غیر پشتون (اُرمڑ) ہیں اور دوم فرقہ روشانیہ کے پیروکار دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ دونوں امور نہایت قوی اور پُرکشش تھے۔

غیر پشتون ہونا تو عوام کی سمجھ میں آ سکتا تھا۔ البتہ اسلام سے خروج اور اس کے عواقب سے عامۃ الناس بے [illegible] تھے سو امرِ ثانی کی تشریح ہو سکتی ہے کہ روشانی عقائد کے علمبرداروں کا خون مُباح ہے۔ جو جس کو قتل کرے اس کا سازوسامان اُس کو غنیمت میں ملے گا۔ نیز یہ جنگی قیدی از روئے اسلام غلام ہوں گے۔ لہٰذا جس کسی کے ہاتھ عورت، مرد یا بچہ لگ جائے وہ اُسے غلام بنا سکتا ہے۔ اور اُسے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے۔

عساکر روشانیہ متواتر جنگوں سے کمزور ہو گئے تھے۔ نیز اُنکا ایک معتدبہ حصہ جنگوں میں کام آ چکا تھا۔ کمک اور رسد کی کمی کی وجہ سے وہ بیماریوں اور بھوک کا شکار تھے۔

یوسفزئی قوم کی ملی قیادت کے سامنے وہ نہ ٹھہر سکے۔ خصوصاً کوہستانی اقوام کی کمکِ مسلسل ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ جنگ باڑہ میدانی علاقہ میں روشانیوں کی قسمت پر مہر قتل ثبت کر گئی۔ فرقہ روشانیہ کی ایک کثیر تعداد موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ جو زندہ بچے انہیں پشتون سپاہ نے اسیر بنا لیا۔ انہیں اسیران جنگ کو مذہبی فتویٰ کی روشنی میں غلام کہا جانے لگا۔ ان غلاموں کی تعداد معلوم نہیں۔ البتہ کسی مرکزی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے غلاموں کی یہ جماعت مختلف لوگوں اور قوموں میں تقسیم ہوئی۔ چنانچہ اسیران جنگ کا بڑا حصہ یوسفزیوں کے قبضے میں آیا۔ یوسفزئی قوم اس وقت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک بڑی اکثریت کی رہنمائی ملک حمزہ خان کے حصے میں آئی۔ جبکہ دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جتھے کی سرداری مُلا میرو مندڑ کے ہاتھوں میں تھی۔ گویا یہ دین و سیاست کی واضح تقسیم تھی۔ جس میں مذہبی سیاست کی جیت ہوئی اور تصوف پسپائی اختیار کرگیا۔

جنگ باڑہ میں فرقہ روشانیہ کے بڑے بڑے علمبردار اپنی جان کھو بیٹھے جن میں قابل ذکر بایزید روشن کے تین بیٹے ہیں۔

۱- شیخ عمر ۲- خیر الدین ۳- نور الدین

سرداروں کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں عام لوگ قتل ہوئے ۔اسیران جنگ میں بایزید روشن کا جوان بیٹا جلال الدین بھی شامل تھا۔ جلال الدین کم عمر اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اُس نے معرکۂ کار زار میں تلوار کے جوہر دکھائے۔ جنگ کا پانسہ پلٹا تو جلال الدین لڑتا بھڑتا دریا میں کُود گیا۔ یوسفزئیوں نے تعاقب کیا مگر قسمت کا دھنی صحیح سلامت تیر کر محاذ جنگ سے کئی میل دور پانی سے نکلا۔ جہاں ایک دیہاتی عورت نے اس کی جوانی اور خوبصورتی پر ترس کھا کر اُسے پناہ دے دی۔ معلوم نہیں وہ کتنے دنوں تک اُس فرشتۂ رحمت کی نگرانی میں رہا؟ تا آنکہ اکبر اعظم کے حکم سے اُسے رہائی ملی۔

غلامانِ روشانیہ

جنگِ باڑہ فرقہ روشانیہ کو میدانی علاقوں سے بے دخل کرنے میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ روشانیہ عقائد کے علمبردار موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ جو بچ رہے وہ اسیران جنگ کا حصہ بنے۔ لیکن یہ اسیرانِ جنگ عام قیدی نہیں تھے۔ ان کے ساتھ انتہائی بُرا رویہ روا رکھا گیا بایزید انصاری کی بیوہ بی بی شمسو کو ایک ڈوم کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اسیرانِ جنگ کو غلام بنا کر مختلف تپوں اور خیلوں میں بانٹا گیا۔ انہیں دوسرے درجے کی شہریت ملی کیونکہ وہ مغلوب اور منہزم فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حالانکہ یہی غلام اگلے زمانے کے سپہ سالار بننے والے تھے۔

جلال الدین اکبر کی آمد

انہی دنوں میں جلال الدین اکبر مرزا حکیم کی شورش دبانے کی خاطر کابل گیا ہوا تھا۔ مرزا حکیم نے سرِتسلیم خم کیا تو اکبر یلغار کرتا ہوا ۱۲ شعبان ۹۸۹ھ کو سندھ ساگر پہنچا۔[۸] اٹک کا قلعہ ابھی بنا نہیں تھا۔ موضع ہنڈ سے دریا عبور کر کے بادشاہِ وقت اٹک کے مقام پر پہنچا مقام عبور موزوں پا کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قلعہ بنوانے کے احکام صادر فرمائے۔

دریں اثنا روشانیوں کے فریادی(مستغیث) اکبر کے دربار میں بازیابی پا گئے۔ انہیں فرقہ روشانیہ کی سرگزشت سنائی[9] اوراسیران جنگ (غلامانِ یوسفزئی) کی حالت زار کا قصہ سنایا ۔خود بھی اکبر اتنے بڑے واقعے سے کیسے بے خبر رہ سکتا تھا؟ سو اسیران جنگ کی رہائی کے لیے احکام صادر ہوئے۔ بادشاہی حکم پا کر بہ امرِ مجبوری یوسفزئیوں نے غلامان روشانیہ کو واگزار کرا کے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔

غلام بنائے جانے کی حقیقت پر تو موافق اور مخالف دونوں فریق کے مؤرخین متفق ہیں۔ اخون درویزہ نے فرقہ روشانیہ کی شکست و اسارت کا قصہ مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ تاہم فرقہ روشانیہ کے معتقد مصنف علی محمد مخلصؔ نے بھی یہ تسلیم کرنے سے گریز نہیں کیا کہ یوسفزئی قوم نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنا کے اپنے گھروں میں رکھا تھا[10] اور اسیران جنگ کی غلامی میں سندھ پار کے لوگ(دلزاک) بھی برابر کے شریک تھے۔ کیونکہ دلزاکوں نے انہیں پناہ دینے کی حامی بھری تھی جس کے بھروسے پر وہ دریا پار اُتر گئے تھے۔

اکبر اعظم نے رُوشانیوں کی رُودادسُنی تو انہیں آزاد کروا کے رخصت کر دیا البتہ جلال الدین عُرف جلالہ کو دربار داری کے لیے موزوں پا کر اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔

جلال الدین نے دربار اکبری میں کتنا عرصہ گزارا اس کا اندازہ معلوم نہیں البتہ دورِ اکبری کے مؤرخ نظام الدین احمد کے بقول جلال الدین اکبر رمضان کی آخری تاریخ کو لاہور پہنچا۔ عیدِ فطر۹۸۹ء لاہور میں گزاری ۵ ذیقعد کو بادشاہ اکبر فتح پور سیکری کے لیے روانہ ہوا۔

علی محمد مخلص نے اپنی کتاب *حالنامہ* میں لکھا ہے کہ جلال الدین عرف جلالہ اپنے معتقدین کے بے حد اصرار پر دربار اکبری سے فرار ہوا۔ دن رات سفر کرتا ہوا وہ براستہ خوشاب علاقہ رُوہستان میں داخل ہوا۔ معلوم رہے کہ پشاور اور بنوں سے ایک راستہ کوہ چیچالی کے بیچ میں سے گزرگاہ تھا۔ اِسی درہ چیچالی سے ہو کر جلالہ اپنے معتقدین کے ہمراہ علاقہ روہ میں داخل ہوا۔ دریائے سندھ کے بائیں کنارے سفر کرتا ہوا جلالہ دوبارہ ضلع صوابی میں وارد ہوا۔ لیکن اس مرتبہ وہ حملہ آور کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح علاقہ رزڑ میں داخل ہوا تھا۔ علاقہ رزڑ(صوابی) میں دوبارہ وارد ہونے کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱- پشاور کا راستہ حکّام کا راستہ تھا۔ لہٰذا حکام مغل سے پہلو تہی کرنے کے لیے صوابی کا راستہ موزوں و مناسب تھا۔

۲- معتقدین با یزید کو اکٹھا کرنے کے لیے علاقہ رزڑ کا دورہ ضروری تھا۔ چونکہ لشکرِ افاغنہ منتشر ہو گیا تھا۔ اس لیے بقیہ السّیف روشانیوں کو ڈھونڈنا اور واگزار کروانا جلالہ کا فرضِ اولین بنتا تھا۔ جسے وہ اپنے حامیوں کی مدد سے نبھا گیا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یوسفزئیوں کے میدانی علاقے میں فرقہ روشانیہ کا اثر و رسوخ کافی حد تک پھیل گیا تھا۔ چونکہ روشانیوں کا دارالخلافہ ''کلا ڈھیر'' تھا جو موجودہ مردان کے قریب کہیں واقع تھا۔ بعض لوگ اسے چارسدہ میں بتاتے ہیں گویا روشانیوں کا دارالحکومت علاقہ یوسفزئی کے دِل کی مانند تھا۔ روشانیوں کا سپہ سالار مُلا میرو گڑھی امازئی (لنگر کوٹ) کا رہنے والا تھا۔ ان حقائق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مردان اور صوابی میں روشانیوں کی اکثریت تھی اور ان لوگوں کے بل بوتے پر انہوں نے حکومت بنائی تھی۔

جلال الدین علاقہ رزڑ میں آیا تو اس کی آؤ بھگت ایک پیر اور پیر زادے کی حیثیت سے ہوئی۔ بڑے بڑے قصبات میں جلالہ کا قیام ایک نئی جنگ کو دعوت دینا تھا۔ لہٰذا علاقہ کے عمائدین نے جلالہ کو سرحدِ رزڑ پر ٹھہروایا۔ اِس ٹھکانے کے چناؤ میں دو مصلحتیں تھیں:

۱- یہ مقام رزڑ (صوابی) اور سدھوم (مردان) کا مقام اتصال تھا۔ بظاہر تو یہ جگہ علاقہ رزڑ میں واقع تھا۔ لیکن مسافت کی وجہ سے صحرا میں شمار ہوتا تھا۔

۲- یہ مقام دُور دراز اور غیر آباد تھا۔ جس تک رسائی آسان نہ تھی۔

دِہ غلامان

روشانیوں کی آمد سے پہلے یقیناً یہ جگہ آباد رہی ہو گی کیونکہ یہاں بدھ مت اور ہندو شاہیہ کے آثار کثرت سے ملے ہیں۔ البتہ دورِ روشانیہ میں یہاں چند گوجر آباد تھے۔ جو عمائدین رزڑ کے باج گزار اور کسان تھے۔ یوسفزئیوں نے روشانی مفرورین کو یہ مقام پناہ گاہ کے طور پر دیا تھا۔ چونکہ جلال الدین اپنے معتقدین کے بے حد اصرار پر دربار اکبری سے بھاگ نکلا تھا اس لیے یہ دُور افتادہ مقام اس کے لیے صحرا میں نخلستان کی مانند تھا۔ یوسفزئیوں اور دلزاکوں کی قید میں جتنے روشانی اسیر تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ایک ایک کر کے یہاں جمع ہوئے۔ چونکہ یہ اسیران جنگ مذہبی فتاویٰ کے مطابق ''غلامانِ غنیمت'' تھے۔ اسی وجہ سے ان کے اجتماع سے یہ غیر معروف مقام ''دِہ غلامان'' کے نام مشہور ہوا۔

اگر طبقات اکبری کے مصنف کو درخور اعتنا سمجھا جائے تو یہ واقعات شعبان۹۸۹ھ سے ذیقعد ۹۸۹ھ کے ہیں۔ جو سن عیسوی ۱۵۸۱ کے برابر مانے جاتے ہیں۔[11] لہٰذا ہم ''دِہ غلامان'' کی آبادی و تاسیس کا سال ۱۵۸۱ء کو سمجھتے ہیں۔ دور اکبری کا ایک یہ سال پشتون تاریخ کا سنگ میل ثابت ہوا۔ کیونکہ اِسی سال اکبر نے قلعہ اٹک کی تعمیر شروع کروائی تھی۔ نیز اِسی سال روشانیوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کے باعث میدانی علاقوں سے ان کے قدم اُکھڑ گئے اور انہوں نے تیراہ (خیبر ایجنسی) اور افغانستان کو اپنا مستقر بنا لیا۔ معلوم نہیں کہ جلال الدین روشانی اور اس کے معتقدین دِہ غلامان میں کتنا عرصہ رہے؟ بہر حال یہ قیام مختصر رہا ہو گا۔ کیونکہ دِہ غلامان بونیر کی سرحد کے قریب ہے اور یہاں کسی بھی وقت طبل جنگ بج سکتا تھا۔ کچھ عرصہ قیام کر کے روشانی پیروکار موضع ''ٹوٹئی'' (مالا کنڈ ایجنسی) کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاں جنگ باڑہ کے تھکے ماندے اور زخمی جمع تھے۔ جن میں جلالؔ کی والدہ ''شمسوؔ'' بھی تھی۔[12]

دِہ غلامان کی وجہ تسمیہ پر راقم نے متعدد بار عمائدین دِہ سے گفتگو کی ہے۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ بادشاہ اکبر کے دربار سے چند غلام بھاگ نکلے تھے۔ جنہوں نے یہاں پناہ لی تھی۔ ان بھاگے ہوئے غلاموں کی وجہ سے اِس مقام کا نام ''دِہ غلامان'' پڑ گیا۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ ''غلامانؔ'' نام کی اور کوئی بستی کہیں اور سننے میں نہیں آئی۔ رحمان بابا نے جس ''دِہ غلامانؔ'' کا ذکر کیا ہے۔ غالباً وہ اسم نکرہ ہے۔ کسی خاص مقام کا نام نہیں۔[13]

اگرچہ فرقہ روشانیہ کے عروج و زوال کو چار سو سال ہوئے ہیں۔ آج بھی ضلع صوابی کے کئی مقامات پر فرقہ روشانیہ کی باقیات دیکھنے میں آتی ہیں۔ موضع کالو خان میں ایک خاندان ''تاریکیان'' کے نام سے اپنی پہچان رکھتا ہے۔ چونکہ پیر روشن (بایزید) کو ان کے مخالفین نے ''پیر تاریک'' کا لقب دیا تھا۔ اس لیے اس کے پیروکار ''تاریکی'' مشہور ہو گئے۔ چار سو سال کی مدتِ میں ''تاریکی'' تاریخ کے اندھیروں میں کھو گئے۔ ورنہ گڑھی امازئی تو مُلا میروؔ کا مسکن تھی اس کی اولاد اور پیروکاروں کی باقیات کہاں گئی؟ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تاریکی سے اُجالے میں آ گئے اور قومی دھارے میں مدغم ہو گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری منزل

مقالے کے پہلے حصے میں ملا میرو کا تعارف کرایا گیا ہے۔ مُلا میرو امان بن عثمان کی اولاد میں سے تھا۔ بایزید انصاری کی تعلیمات سے وہ اس قدر متاثر تھا کہ وہ فرقہ روشانیہ کے قائدین میں شمار ہونے لگا۔ چنانچہ جب قوم یوسفزئی مذہب کے نام پر دو حصوں میں بٹ گئی تو پیروکارانِ بایزید کا سپہ سالار مُلا میرو مقرر ہوا۔ مُلا میرو کا اصل نام ''حسن'' تھا۔ بایزید انصاری کے نظریہ کے مبلّغ ہونے کی وجہ سے اُسے ''مُلا'' کا خطاب مِلا۔ یہی مُلا آگے چل کر فرقہ روشانیہ کے سردارِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوا۔ اگرچہ مؤرخ روشن خان نے ان کا نام ''پیر حسن'' لکھا ہے۔ مگر قرین قیاس ہے کہ اس کا نام ''میر حسن'' ہوگا۔ دینی وظائف و خدمات کی وجہ سے ان کا نام ''مُلا'' پڑ گیا۔ جس میں اس کے نام کا پہلا حصہ ''میر'' سے ''میرو'' ہو گیا۔ مُلا میرو اپنے وقت کا عالم و فاضل اور صاحب عمل سپہ سالار تھا۔ وہ بایزید انصاری کے سچے معتقدین میں شامل تھا۔ چنانچہ اپنی آدرش کی پاسداری کے لیے اُس نے جنگِ مینی ۹۸۹ھ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کی قبر گورنمنٹ کالج کوٹھا (صاحبزادہ خورشید میموریل کالج) سے بجانب غرب قبرستانِ مُلا میرو میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اِسی ملا میرو (میر حسن) کا ایک رشتہ دار اجون خان یا جیون خان تھا۔ جو مُلا میرو کا مخالف اور اخون درویزہ کا معتقد تھا۔ جیون خان فرقہ روشانیہ کے مخالفین کے عمائدین میں سے تھا۔ چنانچہ جس وقت ''مُلا میرو'' پیر روشن کے لشکر کی کمان کر رہا تھا۔ عین اسی زمانہ میں اجون خان، غازی بابا (سید علی ترمذی کا پوتا)، اخون[۱۴] کریم داد (پسرِ اخون درویزہ) اور اخون سالاک کی معیت میں فریق مخالف کے سر برآور دہ اشخاص میں شامل تھا۔ چنانچہ یہ دوستانہ اور مذہبی اتحاد فرقہ روشانیہ کے استیصال کے بعد بھی جاری رہا۔ البتہ محاذ اور رُخ ان کا روشانیوں کی بجائے چیلاس تک علاقہ ڈوما (موجودہ تربیلا جھیل کے دونوں اطراف) کی طرف ہو گیا۔ علاقہ ڈوما کے باسی اس زمانے میں دائرہ اِسلام سے باہر تھے۔ ہندو شاہیہ کے زیر اثر وہ ہندو مت کے علاوہ مختلف قسم کے رسوم و عقائد کے ماننے والے تھے۔ اخون سالاک کی سرکردگی میں یہ علاقہ فتح ہوا۔ اسلام کا پیغام گھر گھر تک پہنچ گیا۔ اجون خان (جیون خان) اور ملا میرو کا شجرہ نسب کچھ اس طرح ہے۔[۱۵]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

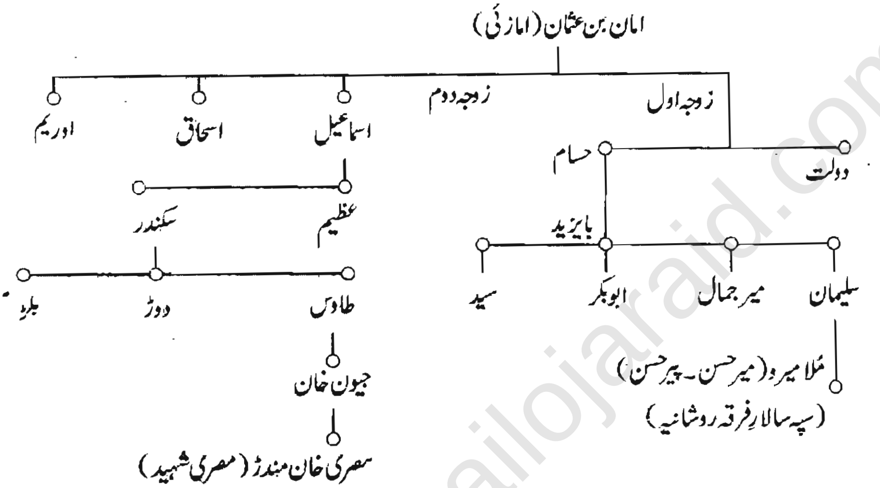

اس شجرہ نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ اجون (جیون) مُلا میرو کا چچا زاد بھائی تھا۔ امان بن عثمان کا خاندان مذہبی رجحانات کے سبب دو مخالف ٹولوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک ٹولے کی قیادت میر حسن (مُلا میرو) کے ہاتھوں میں تھی۔ جبکہ دوسرے جتھے کی رہنمائی کا دعویدار اجون خان (جیون خان) تھا۔ مُلا میرو تحریکِ روشانیہ میں اپنا مقام بنا گیا تھا۔ دوسری طرف اجونخان اخون درویزہ کے دھڑے کے عمائدین میں شمار ہوتا تھا۔ اگرچہ ہمارے پاس جنگ مینئ کی تفصیلی تاریخ نہیں ہے مگر قیاس کیا جاتا ہے کہ اجون خان اپنے مویدین کے ہمراہ، اس جنگ میں اپنے چچا زاد بھائی مُلا میرو کے مدِ مقابل ہوں گے۔ جنگ مینئ ملا میرو کی شکست و موت پر منتج ہوئی۔ آج صرف ''قبرستان مُلا میرو'' اس عظیم مناقشے کی داستانِ درد کی گواہی دے رہا ہے۔ مُلا میرو کی یادگار زندہ ہے اجون خان تاریخ کے گردو غبار میں چھپ گیا ہے۔ البتہ اجون خان کا اُولو العزم بیٹا تاریخ کے صفحات پر اپنا نام ثبت کر گیا ہے۔

حضرت سید علی ترمذی نے شیوخ اسلام کے لیے جو گروپ تشکیل دیا تھا اُس میں اخون درویزہ کے فرزند کریم داد شہید کے سوا اخوند سالاک اجون خان (مندڑ) بھاگو خان اور غازی بابا (سید احمد المعروف بہ خواجہ نور) شامل تھے۔ غازی بابا اِس مہم جہاد کا کماندارِ اعلیٰ تھا۔ ان کا مزار موضع محب (مردان) میں غازی بابا کے نام سے مشہور ہے۔ اس جہادی گروپ کی کوششوں سے کوہ سیاہ کے رہنے والے مسلمان ہوئے۔ اخون سالاک کا مزار کوہ سیاہ کے دامن میں دریائے سندھ کے بائیں کنارے کابل گرام کے مقام پر واقع ہے۔ سید خواجہ نور کا سال وفات ۱۱۰۳ھ ہے۔[۱۹] اِس حساب سے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشہور قوم پرست شاعر خوشحال خان خٹک کے معاصر تھے۔ خوشحال خان کی وفات ۱۱۰۰ھ میں ہوئی۔ اجون خان بھی خوشحال خان خٹک کے معاصر اور قوم مندڑ (یوسفزئی) کے سردار تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اجون خان عمر میں خوشحال خان خٹک سے بڑے ہوں۔ خوشحال خان کے دیوان میں مُلا میرو اور اجون خان کا ذکر تو نہیں ہے۔ ہاں مصری خان مندڑ کے متعلق ان کے دو مذمتی شعر ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخ مرصع میں مصری خان امازئی کی ایک مہم کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ دونوں مصری خان ایک شخص ہیں۔

مصری خان مندڑ

مصری خان مندڑ کا ذکر پشتون زعماء کے سلسلۂ تاریخ میں ملتا ہے۔ چونکہ خوشحال خان شاعر اور آزاد طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کے دیوان میں تقریباً ہر ملتی سورما اپنی ہئیت کذائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چنانچہ مصری خان مندڑ کے متعلق ان کے یہ دو شعر قابل ذکر ہیں۔

۱- ''مصری خان مندڑ کنارے پر مچھلیاں پکڑتا ہے۔ وہ اُود بلاؤ کی طرح مگر مچھ سے سر چھپاتا پھرتا ہے۔

۲- مصری خان مندڑ چھپکے چھپکے جگالی کرتا ہے (مہمانوں کے ڈر سے) جس طرح دوشیزہ ایام ماہواری میں روزہ خوری کرتی ہے''۔[17]

یہ اشعار بقول محقق دوست محمد خان کے ایّام دشمنی کی یادگار ہیں۔ بعد میں خوشحال خان اور مصری خان دوست بن گئے تھے۔ اگرچہ اِن شعروں میں مصری خان کی مذمّت بیان ہوئی ہے۔ تاہم یہ کیا کم ہے کہ خوشحال خان جیسے شاعر کے دیوان میں مصری خان مندڑ اپنی جگہ بنا گیا ہے۔ ان اشعار سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مصری خان اپنے زمانے کا سر بر آوردہ یوسفزئی سردار تھا اور خوشحال جیسے شخص کے لیے اس سے اغماض برتنا ممکن نہ تھا۔

تاریخ مرصع میں خوشحال خان خٹک کی ایک مہم کا ذکر خود اس کی زبانی موجود ہے۔ مہم کی ناکامی پر خوشحال خان خٹک کہتا ہے'' میں اور مصری خان امازئی دونوں آزردہ ہو گئے'' یہ مہم جمادی الاول ۱۰۸۶ھ میں روانہ ہوئی تھی۔[18]

ان تصریحات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مصری خان مندڑ (امازئی) خوشحال خان کے معاصر تھے۔ جہاد ڈوما کے علاوہ مختلف ملی مہمات میں ان کا بھر پور حصہ رہا تھا۔ پشتون تاریخ میں مصری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خان کے نام سے کئی شخصیات کا ذکر موجود ہے جن میں قابل ذکر یہ ہیں؛

۱- مصری خاں: کوہستان روہ سے پہلے مصری خان جو اپنے زمانے کے سردار اور زعیم تھے افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کے معاصر گزرے ہیں۔[۱۹]

۲- مصری خان خٹک: ملک اکوڑ خان کے ایک بیٹے کا نام مصری خان تھا جو خوشحال خان خٹک کے دادا یحییٰ خان کے بھائی تھے۔

۳- مصری خان قلعہ دار: غلہ ڈھیر مردان کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے جہاں مغلوں نے تھانہ بنوایا ہوا تھا۔ اسی تھانہ میں مصری خان مغلوں کی طرف سے تھانیدار یا قلعہ دار تھا۔ یوسفزئیوں نے غلہ ڈھیر کی فتح کے وقت اسے مار ڈالا تھا۔ اسی مصری خان کو تاریخ مرصّع نے مصری خان کوٹیانی لکھا ہے۔

۴- مصری خان مندڑ امازئی: جو مصری شہید کے نام سے بھی مشہور ہے۔ دِہ غلامان کی دوسری منزل کا شاہسوار یہی مصری خان ہے۔ پہلے بیان ہوا ہے کہ مصری خان خوشحال خان خٹک کا معاصر اور یوسفزئی قوم کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھا۔ چونکہ یوسفزئی قوم اورنگزیب بادشاہ کی سخت مخالف ہو گئی تھی۔ تمام علاقے میں بغاوت کی سی کیفیت تھی جس کی وجہ سے بد امنی کا دور دورہ تھا۔ آئے دن کے خرخشوں سے تنگ آ کر مغل شہنشاہ اورنگزیب نے مردان کے قریب موضع گڑھی امازئی میں قلعہ بنوانے کا حکم صادر کیا۔ یہ قلعہ لنگر کوٹ کے نام سے پشتونوں کی تاریخ میں شہرت رکھتا ہے۔ خوشحال خان خٹک نے قلعہ بنوانے کی مخالفت کی تھی چنانچہ اس کے دیوان کے ایک شعر میں اس کا عندیہ بیان ہوا ہے۔

''مغلوں نے لنگر کوٹ بنوایا میں دوبارہ ننگِ افغانی کے ہاتھوں میدان میں کود گیا۔''[۲۰]

۱۶۶۷ء میں خوشحال خان خٹک مغلوں کی قید سے رہا ہوا۔ قلعہ سازی مشورت ۱۶۶۸ء میں ہوئی ہو گی۔ کیونکہ لنگر کوٹ کی تعمیر ۱۶۶۹ء کا واقعہ ہے۔

تاریخ مرصّع میں بھی اس واقعے کا ذکر ملتا ہے 'نواب مہابت خان نے قلعہ بنوانے کا مشورہ مانگا تو میں نے کہا قطعاً نہیں۔ اِس مہم سے باز رہو۔ کیونکہ یوسفزئی قوم اڑیل گدھے کی مانند ہے۔ تمہارے ہاتھ اور کپڑے دونوں لتھڑ جائیں گے اگر تم یوسفزئیوں کو مطیع بنانا چاہتے ہو تو بالائی سوات کے مقام و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغاؔر میں قلعہ بنا لو‘‘-(ورنہ اس قوم کو زیر نہ کر سکو گے)

مقام مشورت میں شمشیر خان ترین بھی بیٹھا تھا۔ اُس نے قلعہ بنوانے کی حمایت کی اور پوشیدہ طور پر بادشاہ اورنگزیب کو لکھا کہ لنگر کوٹ اور ہنڈؔ کے قلعے بنوانا اِنتہائی ضروری ہے بادشاہ موصوف نے نواب مہابتؔ خان کو قلعے بنوانے کی ہدایت کی اور شمشیر خان ترین کو تھانیدارِ لنگر کوٹ مقرر کیا نواب مہابت خان حسب حکم بادشاہ عازم کابل ہوا۔

شمشیر خان ترین یوسفزئیوں کو مطیع بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جس کے پاس ہزاروں مسلح فوج تھی۔ ہنڈؔ اور لنگر کوٹؔ دونوں مقامات علاقہ یوسفزئی کی اہم گزرگاہوں پر واقع تھے۔ قلعہ لنگر کوٹ مصری خان مندڑ کے گاؤں ہی میں تعمیر ہوا تھا۔ لہٰذا یوسفزئی عمائدین اور شمشیر خان کے درمیان تصادم ناگزیر تھا۔ واضح رہے کہ امازئی (مندڑ) یوسفزئی ہیں۔ مصری خان اپنے عہد کا سرکردہ شخص تھا۔ ان کی ہمدردیاں اپنی قوم اور اپنی زمین سے تھیں۔ شمشیر خان بادشاہی حکم کا نفاذ کوہستان روؔہ تک چاہتا تھا۔ جس کی مخالفت گوہی یوسفزئیوں نے شدّ و مد سے کی۔ *تواریخ حافظ رحمت خانی* کے مؤلف نے لکھا ہے۔ کہ مصری خان مندڑ کے خوشحال خان خٹک پر احسانات تھے۔ خوشحال خان کے گھرانے کو علاقہ یوسفزئی میں پناہ دینے والے جرگے میں مصری خان بھی شامل تھا اس عہد میں لنگر کوٹ کا تھانیدار اللہ داد تھا۔ جو مصری مندڑ (امازئی) کو مغل حکومت کے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے مصری خان کو ہلاک کرنے کی غرض سے اُسے زہر دلوا دیا۔ یہ واقعات ۱۶۶۹ء کے بعد کے ہیں کیونکہ اسی سال قلعہ لنگر کوٹ کی تعمیر ہوئی تھی۔ ہم مصری خان کی شہادت کو ۱۶۶۹ء کے بعد مانیں گے۔ کیونکہ اُسے زہر دلوانے میں لنگر کوٹ کے حکام ملوث تھے۔ لنگر کوٹ بننے کے بعد شمشیر خان بطور قلعہ دار تعینات ہوا تھا۔ اللہ داد اور شمشیرؔ دونوں پشتون تھے۔ [۲۱]

مصری خان فوری طور پر نہ مر سکا۔ وہ شدّتِ درد سے بلبلا رہا تھا۔ اس کے بیٹے صاحب خان نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا۔ مصری خان کو بہ حالت تباہ چارپائی پر ڈال کر استمداد کی خاطر بونیر اور سوات کا رخ کیا۔ تا کہ اِس ظلم کا بدلہ لیا جائے۔ امازئی قوم کا یہ جرگہ جب موضع غلامان کے قریب پہنچا تو مصری خان کی آخری سانسیں جاری تھیں۔ لوگوں نے چارپائی رکھوا دی۔ تو مصری خان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ مصری خان کو دِہ غلامان میں سپرد خاک کیا۔ اس کی قبر ’’مصری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہید" کے نام سے عام زیارت گاہ ہے۔[۲۲] واضح رہے کہ اللہ داد شمشیر ترین کا ماتحت آفیسر تھا، زہر دلوانے میں شاید دونوں ملوث تھے۔

مصری خان شہید کے خون کا انتقام

مصری خان شہید کے بیٹے نے مغلوں سے جو انتقام لیا تھا اس کی روداد تواریخ حافظ رحمت خانی کے حاشیہ نگار "روشن خان" کے ایک پیراگراف میں یوں درج ہے۔

> "مصری خان کے لڑکے صاحب خان نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے دیر، سوات اور بونیر پہنچ کر وہاں کے جرگہ سے امداد طلب کی اور لشکر لیے قلعہ لنگر کوٹ کو مسمار کر دیا۔ صرف مسجد چھوڑی۔ جو اب بھی موجود ہے۔ یہ لشکر آگے بڑھا اور اورنگزیب کے دوسرے لشکری اور حامی گروہوں کو غلہ ڈھیر کے مقام پر شکست دے کر تباہ و برباد کر ڈالا۔ لنگر کوٹ کے اس معرکہ میں مغل لشکری اور نائبان حکومت سب مارے گئے اور اس طرح مغل اقتدار سے علاقہ یوسفزئی خالی ہو گیا۔[۲۳]

تاریخ مرصع میں لنگر کوٹ اور غلہ ڈھیر کے قلعوں کی تباہی کا حال مذکور ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تباہی یوسفزئیوں کی لشکرکشی کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ آغاز میں یوسفزئیوں کا لشکر شہباز گڑھی کے قریب جمع ہوا۔ جس کی پشت پناہی خوشحال خان خٹک کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ عساکر یوسفزئی نے لنگر کوٹ کا محاصرہ کیا۔ اگرچہ لنگر کوٹ میں مغل سپاہ کی اعانت کے لیے توپیں بھی موجود تھیں۔ تاہم یوسفزئیوں اور خٹکوں نے مغل سپاہ کے دانت کھٹے کر دیے۔ اس جنگ میں میر ہزارہ اپنے سینکڑوں سپاہیوں کے ساتھ کھیت رہا۔ بعد ازاں یوسفزئیوں نے غلہ ڈھیر پر یورش کی۔ مغلوں کے کئی سو لوگ معرکۂ داروگیر کا شکار ہوئے۔ مغلوں کی بھرپور شکست کے بعد مہابت خان نے مُلتفت خان ولد اصالت خان کو لنگر کوٹ کا تھانیدار بنا کے بھیجا۔ خوشحال خان خٹک نے (جو Carrat and Stic کا کردار نبھا رہے تھے) اپنے بڑے بیٹے اشرف خان کو حکم دیا کہ مُلتفت خان کی اعانت کے لیے اپنی خدمات پیش کر دو سو وہ مُلتفت خان کو سہارا دینے کے لیے لنگرکوٹ پہنچ گیا۔[۲۴]

اس جنگ اور واقعاتِ مناقشہ میں مصری خان مندڑ کا ذکر کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم مغل تھانیداران روہ، شمشیر ترین اور اللہ داد کا تذکرہ بھی علی الترتیب خارج از بحث ہے۔ اس تمام بحث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا خلاصہ یہ ہے کہ مصری خان مندڑ خوشحال خان خٹک کا معاصر تھا۔ مغلوں نے اُسے زہر دلوا کر شہید کر دیا۔ اس کے بیٹے صاحب خان نے اطراف و جوانب سے لشکر جمع کر وا کے اپنے والد کے خون کا انتقام لیا۔ جس کے نتیجے میں لنگر کوٹ اورغلہ ڈھیر کے قلعے مسمار ہوئے سینکڑوں کی تعداد میں لوگ مقتول و مجروح ہوئے۔ خوشحال خان نے لنگر کوٹ نہ بنوانے کا جو مشورہ دیا تھا وہ معقول اور صائب تھا۔ نہ لنگر کوٹ بنتا اور نہ یہ محاربۂ عظیم واقع ہوتا۔ صاحب خان کی وفات کے متعلق تواریخ میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ البتہ اسکی قبر گورنمنٹ ڈگری کالج شیوا ضلع صوابی کے عقب میں پہاڑی چوٹی پر واقع ہے جسے عوام ''شیر شرک بابا'' کے نام سے جانتے ہیں۔[۲۵]

تیسری منزل

دِہ غلامان کی تیسری منزل مختصر مگر اہم ہے۔ اگرچہ یہ منزل تقدم زمانی کے لحاظ سے پہلی منزل کے قریب ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ پہلی منزل نسلی اعتبار سے تیسری منزل سے بندھی ہوئی ہے۔ سو ہم نے پہلی منزل کے بعد دوسری منزل کو رکھا جو در اصل تیسری منزل تھی، اب سنیے دوسری منزل کا حال جو ترتیب کے لحاظ سے تیسری منزل ہے۔

استدراک

تاریخ و تصوف کے جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت کاکا صاحب پشتونیات کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ حضرت کاکا صاحب کی تاریخ پیدائش ۹۸۳ھ ہے جبکہ کاکا صاحب کی وفات ۱۰۶۳ھ ہے۔[۲۶]

حضرت کاکا صاحب کی حیات کا دِہ غلاماں سے گہرا تعلق ہے۔ جس کی تشریح آگے بیان ہو گی۔ حضرت کستیر گل معروف بہ کاکا صاحب کے کئی ماذون و شاگرد تھے۔ جن میں خود ان کے بیٹوں کے علاوہ اخون اسماعیل ساکن سوات (چار باغ) بھی تھے۔ شیخ اسماعیل کے ایک پیر بھائی اخون زُفر کوہستانی تھے۔ اخون زفر ضلع کوہستان (علاقہ پالس) کے رہنے والے تھے۔ چونکہ علاقہ پالس کے لوگ اخون کریم داد، اخون سالاک اور غازی بابا کی کوششوں کی وجہ سے مسلمان ہوئے تھے۔ قیاس یہی ہے کہ ان غزوات کے دوران اخون زفر بچے ہوں گے۔ یوسفزئیوں کی یورشوں کے دوران اخون کے گھر میں اسلام کی روشنی پہنچی ہوگی۔ لہٰذا اخون زفر نے بچپن میں کوہستان کو خیر باد کہا ہو گا۔ اخون زفر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے سفر کے دوران کہاں کہاں رہا؟ اس سوال کا جواب مشکل ہے۔ البتہ تذکرہ شیخ رحمکار میں جو کچھ مذکور ہے ہم اس کا حوالہ دیں گے۔ جس سے ثابت ہو گا کہ حضرت کستیر گل کاکا صاحب کے حین حیات میں دِہ غلامان میں باقاعدہ حلقہ درس قائم تھا۔ جس میں منتہی طلباء پڑھتے تھے بلکہ موضع غلامان میں اپنے عہد کے جید عالم بھی موجود تھے۔ تذکرہ رحمکار میں درج ہے۔(ملخص پڑھیے)

''اخون زُفر کوہستانی اپنے ایک عربی مکتوب میں بیان کرتے ہیں کہ زمانہ طالب علمی میں، میں ایک گاؤں ''دِہ غلامان'' میں مقیم تھا۔ میرا اُستاد مجھے شرح عقاید جلالی پڑھا رہے تھے اور یہ تدریس شرح اخون یوسف کی مدد سے ہو رہی تھی۔ دریں اثناء ایک ایسا مسئلہ ہمارے سامنے آیا کہ میرا شیخ اور میں دونوں درماندہ ہو گئے سو ہم نے حضرت کاکا صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری سمجھا۔ جو میرے شیخ (مولانا دِہ غلامان)' کے مُرشد اور معلّم تھے۔ ہم جس دن وہاں پہنچے وہ پنجشنبہ کا دن تھا۔ حضرت کاکا صاحب اِسی دن سلوک و معرفت پر درس دیا کرتے تھے ہم داخل مجلس ہوئے تو حضرت کاکا صاحب نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ دوران تقریر انہوں نے سلوک و معرفت کے انتہائی غامض نکات بیان کیے۔ دوران گفتگو ہماری مشکل ان کی تصریحات سے حل ہو گئی اور ہمیں پوچھنے کی نوبت تک نہ آئی۔'' تذکرہ شیخ رحمکار ص ص ۱۳۸ ، ۱۳۹۔

اِس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حیاتِ حضرت شیخ رحمکار (۹۸۳ تا ۱۰۶۳ھ) کے دوران دِہ غلامان کے اندر ایک مشہور عالم درس و تدریس میں مشغول تھے۔ جن کا نام اور حیات اب تک معلوم نہیں۔ ان حضرت کے مرید اور شاگرد اخون زُفر کوہستانی تھے۔ سو یہ امر محقق ہے کہ اخون زفر کوہستانی ۱۰۶۳ھ سے پہلے دِہ غلامان میں ایک جید عالم اور مدرس کے ہاں مقیم تھے۔ اگرچہ اس عالم اور مدرس کی حیات اور کار ہائے نمایاں کے متعلق ہمارے پاس چنداں معلومات نہیں ہیں۔ تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اخون زفر کوہستانی کا قیام دِہ غلامان میں خوشحال خان کی وفات سے تیس سے بتیس سال پہلے تھا۔ اِس حساب سے اخون زفر کوہستانی اور ہماری دوسری منزل کے ہیرو مصری خان شہید ایک ہی عہد اور ایک ہی زمانہ کے لوگ تھے۔

اخون زفر کوہستانی کے علمی کاموں سے ہم نا واقف ہیں۔ البتہ تذکرہ شیخ رحمکار میں ایک منظوم اندراج اخون زفر کی طرف منسوب ہے۔ جس سے ان کے رتبے اور علمیت کا اندازہ کسی حد تک ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتا ہے۔ اقتباس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت کاکا صاحب کی وفات کے بعد موضع باگرام (پشاور) کے چند ہندو مسلمان ہوئے۔ اس واقعہ کی یادگار میں اخون زُفر نے چند شعر کہے ہیں شعر یہ ہیں

جہاں روشن شوداز پرتوِ او ضیاء دُور نہ بود زخورشید انور
چو نور ہدایت ضیاء داشت ظاہر۔ سُوئے کعبہ راجع شدہ نسل کافر
زقعرِ سقر سوئے ساحل برآمد بہ دریائے دیں متین شد شناور
ز شہد شہادت شدہ کام شیریں نفی مرابہ اثبات کردہ مکرّر
مرا نفس بد کیش ہندو نِصال است کہ ہر دم رو دسوئے اصنام آوز
زعشق بتان نیک معلوم گشتہ زُفر بخش مارا کہ باشم مظفر۲۷

ایک تو اِن اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اخون زُفر شعر و ادب کا رچا ہوا مزاج رکھتے تھے۔ وہ عربی فارسی اور پشتو کے قادر الکلام شاعر اور استاد تھے۔ آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید زُفر کے سوا وہ مظفر سے بھی متخلص تھے۔تذکرہ شیخ رحمکارؒ ص ص ۲۱۲، ۲۱۳۔

قارئین نے اِس مقالے کے دوسرے پڑاؤ میں پڑھا ہے کہ مصریؔ خان شہید اور مغل منصبداروں کے درمیان کیا کشمکش تھی؟ مصریؔ خان کیوں بے دردی سے شہید ہوئے؟ یہ تمام واقعات حضرت کاکا صاحب کی وفات کے بعد کے ہیں۔ کیونکہ حضرت کاکا صاحب کا وصال ۱۰۶۳ھ میں ہوا ہے۔ جبکہ مصری خان کی شہادت کا واقعہ ۱۰۸۰ھ کے لگ بھگ ہے۔ اِس تاریخی تسلسل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصری خان کی وفات سے بہت پہلے دِہ غلامان میں حلقہ درس وارشاد قائم تھا۔ ۱۰۶۳ھ سے پہلے اخون زفر کوہستانی دِہ غلامان میں اپنے اُستاد سے عقاید جلالی کی شرح پڑھ رہے تھے۔

اخون زُفر کوہستانی کون تھے؟ ان کی حیات اور تفصیلات کے متعلق پشتون تاریخ خاموش ہے البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاد کوہستان جو غازی باباؔ اوراخونؔ سالاک کی سرکردگی میں علاقہ ڈوما (کوہ سیاہ) میں ہوا تھا، کے سلسلہ میں اخون زُفر کو ان مشائخ و مجاہدین کی رفاقت میں علاقہ رزڑ میں آنا نصیب ہوا ہو گا۔

اخون زُفر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ مظفر تخلص رکھتا ہو گا یہ تمام تفصیلات تذکرہ شیخ رحمکار میں درج ہیں۔ جس کا ماخذ مجموع البرکات ہے۔ مجموع البرکات حضرت کاکا صاحب کے ایک معتقد عبداللہ کی تصنیف ہے جو شیر درہ کا رہنے والا تھا۔ اور بعد ازاں چارسدہ منتقل ہوا تھا بحث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلب امور:۔

۱۔ اخون زُفر دِہ غلامان میں کن حضرت کے شاگرد رشید تھے؟

۲۔ اخون زُفر اور حضرت کاکا صاحب میں اُستادی و شاگردی کا رشتہ کب اور کس دور تک قائم رہا؟

۳۔ اخون زفر کی کتابیں کون کونسی ہیں؟

اخون زُفر کے متعلق تمام تذکروں میں درج ہے کہ وہ حضرت کاکا صاحب کے خلفاء[۲۸] میں دوسرے نمبر پر تھے۔ اول نمبر کے خلیفہ اخون اسمٰعیل چار باغ (سوات) تھے۔ روحانی رابطہ میں اخون زُفر کا مزار پالس علاقہ کوہستان میں بتایا گیا ہے۔[۲۹] مشہور ماہر پشتونیات بنیرکا رحمکار صاحب بہادر شاہ ظفر کاکا خیل نے اپنے مکتوبات میں اخون زُفر کی حیات اور کام سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے لیے یہ کیا کم ہے کہ اخون زفر کوہستانی ''دِہ غلامان'' کی دوسری قابلِ ذکر شخصیت ہیں۔ جن کی وجہ سے دِہ غلامان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

چوتھی منزل

دِہ غلامان میں سادات کا ورود

حضرت پیر بابا کی اولاد میں سید خواجہ نور کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سیادت کے علاوہ وہ قیادت کی خصوصیات سے بھی متصف تھے۔ جہادی سرگرمیوں کے باعث ان کے گھرانے کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ پشاور سے لے کر ہزارہ تک کے قصبوں او کشالوں کے تصفیوں کے لیے ان کی ذات سے رجوع کیا جاتا تھا۔ پشتونوں نے اپنے ملکیتی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے بڑے بڑے تپوں (علاقوں) کی سرحدات کی جائیدادیں خواجہ نور کو بطور پیشکش دے دیں۔ جنہیں عرف عام میں ''سیریٔ'' کہا جاتا ہے ان پیشکشوں کی دو وجوہات تھیں۔

۱۔ خیرو برکت کا حصول ۲۔ علاقائی تنازعات میں سادات کی ثالثی (بفرزون)

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یوسفزئیوں نے جرگہ کر کے سید خواجہ نور کو یہ مواضعات دیے تھے یا فرداً فرداً رئیسانِ تپہ نے سادات کو حدفاصل (Bufferzone) پر آباد کروانے کی درخواست کی تھی۔ بہر حال سیرئیوں (جائیدادوں) کی پیشکش کا واقعہ سید خواجہ نور کی زندگی میں ہوا ہے ۔ سید خواجہ نور کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدائش۱۶۳۳ء میں ہوئی تھی جبکہ وفات کا سال۱۶۹۱ء بیان کیاجاتا ہے۔[۳۰]

زیارت غلامان

پشتونوں نے ہمیشہ مذہبی گھرانوں کی قدر و منزلت کی ہے۔ سادات کرام اور شیخان عظام کو پشتون سوسائٹی میں عزت و احترام کا مقام حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادات کرام کی ثالثی کسی جھگڑے یا قضیئے میں رد نہیں کی جاتی تھی۔ سادات کرام کے مواضعات کے ناموں کے ساتھ اکثر ''شریف'' یا ''زیارت'' کا لاحقہ لگایا جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ لاحقے متروک ہو گئے ۔دِہ غلامان میں سادات کرام کی آمد کے بعداس گاؤں کا نام غلامان زیارت پڑھ گیا۔[۳۱] یہ نام کتنے عرصے تک رہا؟ کچھ کہانہیں جا سکتا البتہ اخون عبدالغفور جدِ والیان سوات کی پناہ گزینی کے وقت تک غلامان کا نام ''زیارت غلامان'' تھا جس پر اِس مقالہ کی پانچویں منزل میں بحث ہو گی۔دِہ غلامان سے زیارت غلامان کا عرصہ تقریباً سو سال پر محیط ہے۔ سید خواجہ نور اور ان کی اولاد امجاد کی شرافت و نجابت کی وجہ سے یہ نام سینکڑوں سالوں تک رہا۔ تا آنکہ سکھا شاہی میں دیگر مواضعات کے ساتھ زیارت غلامان بھی جل کر خاکستر ہو گیا۔[۳۲]

سادات غلامان

سید خواجہ نور کے سات بیٹے تھے، سید قطب الدین کے دو بیٹوں کی اولاد دِہ غلامان میں آباد ہو گئی۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ سید خواجہ نور نے دِہ غلامان کو اپنے بیٹے سید قطب الدین کی نذر کر دیا تھا۔ سید قطب الدین کے بیٹے سید نور محمد نے ستی گرام(بونیر) سے آ کر غلامان میں سکونت اختیار کی جبکہ اس کا دوسرا بھائی شرف الدین جوانی میں فوت ہوا۔ شرف الدین کے دونوں بیٹے(سید عمران اور سید حسان) اپنی نانی کے گھر پکھلی (مانسہرہ) منتقل ہو گئے۔کیونکہ اس زمانے میں مانسہرہ میں سادات کرام کی ریاست قائم تھی۔ ریاست پکھلی (مانسہرہ) کے بانی سید جلال تھے۔ جو حضرت پیر بابا کے پڑپوتے تھے۔

پکھلی (مانسہرہ) میں سید عمران اور سید حسان اپنے ننھیال میں کتنا عرصہ رہے؟ کچھ نہیں معلوم۔ البتہ ان یتیم بچوں کے آنے کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ سید نور محمد اور اس کے بیٹوں کی مقامی آبادی سے ان بن ہو گئی۔ مقامی لوگوں میں سے چند کی یہ صلاح ٹھہری کہ دِہ غلامان سید قطب الدین کی جاگیر ہے۔ لہٰذا اس گاؤں پر اس کے دوسرے بیٹے سید شرف الدین کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا سید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نور محمد کا۔ دِہ غلامان کی مقامی آبادی کا ایک جرگہ سنی گرام(بونیر) گیا۔ وہاں کے سادات کرام نے بھی سید شرف الدین کا حق تسلیم کیا۔ ان دنوں سید شرف الدین کی وفات ہوئی تھی، ان کے دونوں یتیم بیٹے پکھلیٔ (مانسہرہ) میں مقیم تھے۔ ان کو مانسہرہ سے بلوا کر بونیر اور پھر وہاں سے غلامان کاروان کی شکل میں روانہ کر دیا گیا۔ یہ کاروان کوئی شاہی کاروان نہیں تھا۔ بلکہ چند لوگوں کا ایک چھوٹا قافلہ تھا۔ جس میں مرکزی اہمیت کی حامل ایک بیوہ اور اس کے دو یتیم بچے تھے۔ یہ واقعہ ۱۶۸۰ء کے لگ بھگ رونما ہوا ہو گا کیونکہ تاریخ پشاور میں ۱۷۰۰ء کے واقعات میں سید عمران اور سید حسان کے نام بطور مالکان دِہ غلامان درج ہیں۔ آسانی کی خاطر یہ شجرہ ملاحظہ ہو۔

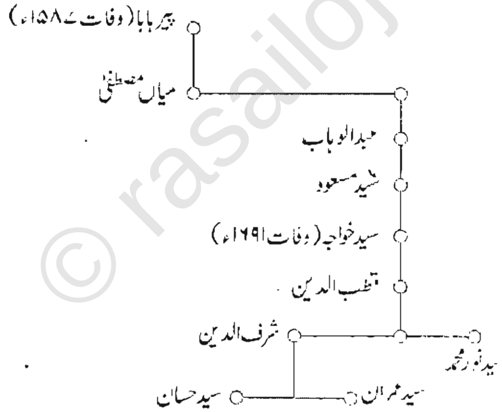

کہتے ہیں کہ غلامان آتے وقت سید عمران کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ جبکہ سید حسان نوکر کے کاندھے پر سوار غلامان تشریف لائے تھے۔ غلامان کی آبادی اور جائیداد دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔

۱- مشرقی بازو ۲- مغربی بازو

چونکہ سید نور محمد ابن سید قطب الدین غلامان میں پہلے آئے تھے اسی وجہ سے اُسے دِہ غلامان کا پرانا گاؤں(مشرقی بازو) حصے میں ملا۔ جبکہ سید عمران اور سید حسان کے آنے پر انہیں نسبتاً نئے حصے(مغربی غلامان) میں آباد کرایا گیا۔

سید عمران اپنے وقت کے زعماء اور مشران میں شمار ہوتے تھے اس کے چھوٹے بھائی سید حسان کو کسی لڑکی سے پیار ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ لڑکی سادات کے خاندان سے باہر تھی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق یہ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا سید حسان اس لڑکی کو لے کر گڑھی امازئی چلے گئے۔ معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں یہ جلا وطنی کتنے عرصہ تک جاری رہی؟ بہر حال عمائدین علاقہ بیچ میں پڑ گئے۔ پھر سید حسان کوہ کڑامار کے دامن میں مقیم ہو گئے تھے۔ عمائدین علاقہ کے فیصلے کے مطابق سید حسان کی تمام جائیداد اس فعلِ شنیع کی سزا کے طور پر بحق سرکار (سید عمران) ضبط ہوگئی اور سید حسان کو غلامان زیارت میں دوبارہ ورود کی اجازت مل گئی۔[۳۳] سید حسان کی اولاد غلامان کے سوا ترلاندی اور نوشہرہ میں بھی ہے۔ جبکہ سید عمران کی تقریباً تمام اولاد غلامان میں شادو آباد ہے۔

سید عمران اور سید حسان دونوں کی قبریں غلامان کے قبرستان میں نمایاں ہیں۔ اگرچہ ان دونوں حضرات کی تاریخ وفات معلوم نہیں تاہم ان کی وفات محفوظ طور پر ۱۷۳۰ء کے لگ بھگ بیان کی جا سکتی ہے۔[۳۴]

پانچویں منزل

دِہ غلامان کی پانچویں منزل بھی گزشتہ کڑیوں سے مربوط ہے۔ غلامان سادات کرام کے ورود کے ساتھ غلامان زیارت بن گیا تھا۔ سید عمرانؒ کے دور میں غلامان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ سید عمران کا شمار شمالی رزڑ کے سرکردہ مشران میں ہوتا تھا۔ سید خواجہ نور کے زمانے میں غیر مسلم کوہستانیوں سے جو جہاد جاری تھا وہ تقریباً اب ختم ہوچکا تھا۔ سید عمران کی وفات کے بعد ان کے پوتے بڈوشاہ کے زمانے میں سید احمد شہید بریلوی براستہ افغانستان وادئ پشاور میں بغرض جہاد داخل ہوئے۔ سید احمد شہید کے اعلان جہاد پر لبیک کہنے والے لوگوں میں سادات کرام پیش پیش تھے۔ چنانچہ اس خطے کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ سید اکبر شاہ ساکن ستھانہ اس جہاد کے روح و رواں تھے۔ سید اکبر شاہ حضرت پیر بابا کی اولاد میں نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ سید اکبر شاہ سادات غلامان کے رشتہ دار اور ہم نسب تھے۔ لہٰذا ان کی کمان میں جو لشکر تھا اس میں سادات کرام کی بڑی تعداد نے شرکت کی سید اکبر شاہ کو تاریخ میں مجاہد کبیرؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی وفات ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی۔ جس پر انگریزوں نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ کیونکہ جنگ آزادی کو کچلنے میں اب کوئی روڑا اٹکا نہ رہا تھا۔[۳۵]

متعدد جنگوں کے بعد سید احمد شہید ضلع صوابی میں مقیم ہو گئے۔ صوابی کے عمائدین کے سوا مشائخ و علماء بھی سید احمد کی رفاقت میں سکھا شاہی کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ان مشائخ میں قابل ذکر مولانا سید امیر (ساکن کوٹھا) اور اخون عبدالغفور (سواتی) تھے۔ مولانا سید امیر اعلیٰ پائے کے عالم اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدرس تھے۔ جبکہ اخون عبدالغفور موضع بیکا میں دریائے سندھ کے کنارے تصوف و تقشف کے مراحل طے کرنے میں مصروف تھے۔[٣٦] لیکن ان دونوں حضرات کی سید احمد شہیدؒ سے عقیدت و محبت تھی۔ مولانا سید امیرؒ عملاً تحریک جہاد کا حصہ تھے۔

تحریک جہاد کے طالب علم جانتے ہیں کہ سید احمد شہید کا طریق جنگ انوکھا اور عربوں جیسا تھا۔ ان کی حکمت عملی میں ''شب خون'' کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ پشاور، نوشہرہ اور صوابی کے بیشتر حصوں پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے ''قلعہ اٹک'' پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا۔ اس شبخون کے لیے موضع ''زیدہ'' میں مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں سید امیر آف کوٹھا بھی شامل تھے۔ مجلس میں شبخون کے سازوسامان اور مراحل پر بات ہوئی۔ اتفاق سے اس وقت اخون عبدالغفور موضع بیکا سے بغرض ملاقات سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُس زمانے میں اخون عبدالغفور اور سید امیر صاحب کے درمیان دوستی تھی۔ اگرچہ یہ دوستی بعد میں اختلاف و افتراق کی شکل اختیار کر گئی۔ سید امیرؒ نے جوشِ اسلامی اور رشتۂ مودت سے مغلوب ہو کر آسمانوں کی بات زمین کے محرم کو بتا دی'' کہ انشاء اللہ مجاہدین ایک دو دن میں قلعہ اٹک پر پرچم اسلامی لہرائیں گے''۔ واضح رہے کہ قلعہ اٹک اس وقت سکھوں کی لشکر گاہ تھا۔

اخون عبدالغفور نے جاتے ہوئے یہ راز خان آف ہنڈ (شادی خان) کے گوش گزار کر دیا۔ شادی خان کے اقتدار کو تحریک جہاد سے سخت خطرہ تھا۔ اپنی خانی بچانے کے لیے وہ سکھوں سے پوشیدہ طور پر ملا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً آدمی دوڑا کر اٹک کے قلعہ دار تک یہ راز پہنچا دیا۔ وقتِ معہودہ پر شب خون ناکام ہوا۔ مجاہدین کے دسویں افراد تیل کی گرم کڑاہیوں میں ڈالے گئے۔ بعد ازاں یہ غداری ہندوستان کی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔[٣٧]

سید احمد شہید نے غداری کا مزہ چکھانے کے لیے تاریخی قلعہ ہنڈ پر شبخون مارا جس میں شادی خان اپنے بیٹوں سمیت کیفر کردار کو پہنچا۔ اخون عبدالغفور نے شادی خان کا انجام سنا تو جان بچانے کی خاطر نظام پور بھاگ گیا۔ چونکہ سید صاحب مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اس لیے اخون آف سوات کا تعاقب نہ ہو سکا۔ جب ١٨٢٩ء میں خوانینِ پشاور و مردان نے بیک وقت سید صاحب کے عمال کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ تو سید صاحب دلِ برداشتہ ہو کر ستھانہ (امب) چلے گئے۔ پوشیدہ نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے کہ امب دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹی سی ریاست تھی جسکے نوابین سکھوں کے باج گزار تھے۔

شادی خان کے قتل کا واقعہ اگست ۱۸۲۹ء کا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ تسخیر اٹک کا پروگرام ۱۸۲۹ کے اوائل کا ہو گا۔ شادی خان کے قتل کے بعد خوانین پشاور و مردان سید صاحب کی حکومت و شریعت سے ڈر گئے۔ نومبر ۱۸۲۹ میں مجاہدین کے عمال و قضاۃ کا قتل عام ہوا۔ جس کے بعد سید صاحب ستھانہ اور بعد ازاں بٹگرام مانسہرہ ہوتے ہوئے بالا کوٹ گئے وہ ان پہاڑوں میں تقریباً ۲ سال تک رہے۔ تا آنکہ ۷ مئی ۱۸۳۱ء کو بمقام بالا کوٹ جام شہادت نوش کر گئے۔[۳۸]

سید صاحب کی وفات کے بعد، اخون صاحب آف سوات اپنی پناہ گاہ خوڑہ (نظام پور) سے نکل کر موضع غلامان آ گئے۔ موضع غلامان میں آنے کی کئی وجوہات ہیں۔

۱- موضع غلامان سادات کرام کی بستی اور مامن کی حیثیت رکھتا تھا۔

۲- سادات کرام کی وساطت سے مجاہدین اوراخون صاحب کے درمیان صلح و صفائی کے امکانات زیادہ تھے۔ کیونکہ مجاہدِ کبیر سید اکبر شاہ سادات غلامان کے رشتہ دار اور مقتداء تھے۔

۳- مفروری کا عرصہ گزار کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے لیے رزڑ (صوابی) میں مستقر بنانا اخون صاحب کی ضرورت تھا۔

اخون صاحب آف سوات ۱۸۳۱ء میں غلامان زیارت آئے۔ گاؤں کے غربی حصے میں (سید عمران اور سید حسان کی مسجد میں) چلہ کش ہوئے۔ جنوبی صوابی میں اس کی شہرت کو جو دھبہ لگا تھا۔ غلامان زیارت کے قیام نے اس کالک کو دھودیا۔ ایک سال کے بعد علاقے کے با اثر شیوخ نے ان سے بیعت کی۔ جن میں مشہور نام اسوٹا بابا جی، قاضی عبدالمجید پرمولی، شیخ بابا آف تاجہ کے ہیں۔[۳۹] مخفی نہ رہے کہ غلامان میں آنے سے پہلے، اخون صاحب آف سوات کی شناسائی مولانا محمد اعظم (باڑی بابا) سے ہوئی تھی۔ مولانا محمد اعظم المعروف باڑی بابا مصری خان منڈر کے ہم نسل تھے گڑھی امازئی سے نقل مکانی کر کے، غلامان میں بس گئے ان کی اولاد اب تک غلامان میں خوشحال وآباد ہے۔ گوشۂ غربت سے نکل کر اخون عبدالغفور غلامان میں باڑی بابا اور سید بڈو شاہ کی پناہ میں رہنے لگے۔ تین سال گزارنے کے بعد اخون آف سوات موضع سلیم خان (صوابی) چلے گئے۔ اب ان کے لیے راستہ صاف تھا وہ کہیں بھی جا سکتے تھے۔ موضع سلیم خان میں قیام کے دوران معتقدین سید امیر اور پیروکاران اخون میں مسلکی اختلافات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۰- روشن خان مرحوم سے راقم کی ملاقات اور تبادلہ خیالات ۱۹۸۷ء۔

۲۱- روشن خان، تواریخ حافظ رحمت خانی، بحوالہ سابقہ، ص ۵۸۔

۲۲- افضل خان خٹک، تاریخ مرصع، بحوالہ سابقہ، ص ص ۳۲۴، ۳۲۵۔

۲۳- مؤرخ روشن خان اور دیگر مشران سے تبادلۂ خیالات کا نتیجہ۔

۲۴- افضل خان خٹک، تاریخ مرصع بحوالہ سابقہ، ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۴۶۔

۲۵- بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، شیخ رحمکار، چاپڑی کوہاٹ روڈ، پشاور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۵۔

۲۶- سیاح الدین کاکاخیل، تذکرۃ رحمکار، ادارہ اشاعت الاسلام، لائل پور (فیصل آباد) ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۲۔

۲۷- ایضاً۔

۲۸- عبدالحلیم اثرافغان، روحانی رابطہ، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۶۰ء، ص ۹۹۴۔

۲۹- بہادر شاہ ظفر کے مکتوبات (خطی) مملوکہ راقم۔

۳۰- سید عبدالجبار شاہ، کتاب العمرۃ، سابق والی سوات، ذکر سید حسین شاہ، ص ۱۱۴، مملوکہ بریگیڈئر سید محمد، ایبٹ آباد۔

۳۱- خاندانی روایات، راقم۔

۳۲- ایضاً۔

۳۳- سید حسن اور سید حسان، ''رحیم شاہ رحیم'' پشتو سالنامہ، ۱۹۹۱، ۱۹۹۲ء، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی۔

۳۴- مؤرخ روشن خان سے راقم کی ملاقات (ماخوذ از ذاتی روزنامچہ)

۳۵- غلام رسول مہر، حوالہ سابقہ، ص ۲۰۳۔

۳۶- Dr. Billow Culcatta Papers, P.H. 1863, *A General Report on Yousafzais* p. 24-25.

۳۷- غلام رسول مہر، حوالہ سابقہ، ص ۲۱۹،

۳۸- ایضاً۔

۳۹- راقم کی خاندانی روایات و مشرانِ دِہ غلاماں کے انٹرویوز (ذاتی ڈائری)۔

۴۰- ایم۔ پردیش شاہین، ''معرکۂ امبیلہ (غزائے امبیلہ)''، ماہنامہ پشتو، سوات باباجی نمبر، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی، ۱۹۸۶ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا امین احسن اصلاحی سے ملاقاتیں

سید محمد ذوالقرنین زیدی*

امین اصلاحی ۱۹۰۴ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ حیدرآباد دکن میں پانچ سال مقیم رہے۔ اس دوران میں انگریزی زبان اور فلسفۂ جدید میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء روزنامہ ''مدینہ'' بجنور کے مدیر تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف رہے۔ آپ کی سب سے معرکۃ الآرا کتاب ''تدبر قرآن'' ہے جو کہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۷ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا امین احسن اصلاحی جماعت اسلامی کی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تقریباً سترہ سال جماعت اسلامی کی خدمت گزاری میں صرف کیے۔ جماعتِ اسلامی ۱۹۵۵-۵۶ میں اندرونی بُحران کا شکار ہوگئی جس کے نتیجہ میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مجھے مولانا صاحب سے ملنے کا دو مرتبہ اتفاق ہوا۔ جماعت اسلامی میں شمولیت سے لیکر جماعت اسلامی سے جدائی تک کے تمام اہم واقعات پر انہوں نے بڑے بے تکلف اور پُر وقار طریقے سے روشنی ڈالی اور میرے سوالات کے تسلی بخش اور علم افروز جوابات عنایت فرمائے۔ گو وہ اس زمانہ میں بیمار تھے اور ضعیفی نے ان کو گھیر رکھا تھا مگر ان کا حافظہ اور ذہنی چستی قابلِ رشک تھی۔ بہت کم لوگوں سے انہوں نے اس طریقے سے گفتگو فرمائی ہے۔ ان کی تمام گفتگو ٹیپ شدہ ہے۔ ان کے الفاظ اور ان کے خیالات جس طرح سے انہوں نے پیش کیے ہیں من وعن نقل کیے ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر آدابِ گرامر کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ جس شائستگی، بے تکلفی اور وضعداری کے ساتھ انہوں نے مولانا مودودی کی شخصیت، جماعت اسلامی کی کارکردگی، مُسلم اُمّہ اور

---

* پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبہ تاریخ، فیڈرل گورنمنٹ کالج، ایچ-۹، اسلام آباد۔

© rasailojaraid.com